یا میرے عضو بہ میں پیاس کے بجھ جانے کا احساس پیدا کر دیتا ہے اسی طرح کائنات کا ہر سانحہ چاہے وہ کسی سطح پر رونما ہو رہا ہو خود خدا ہی کے ارادے کا مرہون منت ہے ۔گویا تمام معجزات معمول کے عین مطابق اور سراسر فطری ہیں اور تمام فطرت کلیتہً معجزات پر مشتمل ہے ۔ یہ بالخصوص فرقہ اشاعرہ کا نظریہ تھا جنہوں نے قرآنی آیت اِنَّ اللہَ علےٰ کل شیءٍ قدیر کی خالص لفظی تعبیر کو قبول کر لیا تھا ۔ ان کا عمومی موقف یہ تھا کہ اگر ہم کائنات میں موجود ارادی یا غیر ارادی فعلیتوں کو تسلیم کر لیں تو اس سے خدا کے قادر مطلق ہونے پر حرف آنے کا اور اس کی طاقت محدود ہو جائے گی ۔

اس فلسفہ علت و معلول کے بالکل برعکس نظریہ یہ ہے کہ قوانین فطرت میں ریاضیاتی اور منطقی لزوم کی سی حیثیت موجود ہے ۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا ۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی فعل قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قوانین اُس کے عملی عہد کی حیثیت رکھتے ہیں معتزلہ نے اسی نظریے کو اختیار کیا تھا ۔ جدید مسلم فکر میں سرسید احمد خاں کو اس نقطۂ نظر کا پیش رو خیال کیا جاتا ہے اُن کی رائے یہ ہے کہ خدا جو قوانین بھی چاہے بنا سکتا ہے لیکن ایک دفعہ جب وہ انہیں بنا دیتا ہے تو پھر وہ مستقل طور پر نافذ العمل ہو جاتے ہیں ۔ سرسید کی یہ رائے دراصل انیسویں صدی کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دیکھی جانی چاہیئے وہ دور عمومی طور پر مادیت کے عروج اور فطری قوانین کی جبریت پر ایمان و اعتقاد کا دور تھا ۔

اِن دو نقطۂ ہائے نظر کے درمیان عوام الناس کا نظریہ یہ ہے کہ عام حالات میں تو قوانینِ فطرت موثر رہتے ہیں لیکن جب خدا چاہے ان میں دخل انداز ہو کر کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر کر سکتا ہے جسے مذہب کی زبان میں معجزہ کہتے ہیں اور جو متعلقہ شخص کی عظمت کی دلیل سمجھا جاتا ہے ۔ سطور ذیل میں اسی عمومی موقف کی فلسفیانہ توجیہہ کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ کا بھرپور عملی دخل بھی ثابت ہو جاتا ہے اور قوانین فطرت کی ساکھ

نہیں ہے لیکن تمام بڑے بڑے مذاہب ان سے ماورائی رُوح اور اس کے درجات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کوئی غیر معمولی واقعہ جو رُوحانی قوت کے ذریعے کسی پیغمبر یا ولی سے سرزد ہوتا ہے وہ کوئی فوق الفطرت چیز نہیں ہوتی — بشرطیکہ ہم لفظ فطرت کو وسیع ترین مفہوم میں ساری کائنات پر محیط سمجھیں — ہوتا صرف یہ ہے کہ ایک برتر سطح کی علیّت ادنیٰ سطح کے وجود میں تعلیلی نتائج کو بدل دیتی ہے۔ اب اگر ہمارا خدا ایک شخصی خدا ہے جیسا کہ یقیناً ہے اور قرآن کا بھی واضح طور پر یہی موقف ہے تو پھر الوہیت کی سطح پر بھی ایک خاص نوع کی علیّت موجود ہونی چاہیئے جو اپنے تمام ماتحت طبقات پر اثر انداز ہو کر ان میں تبدیلی پیدا کر سکے۔ جس طرح حیات مادہ کے افعال بدل سکتی ہے اور ذہن حیات کے اعمال میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے اسی طرح ایک شخصی خدا میں بھی یہ قدرت اور قوت ہونی چاہیئے کہ برتنے کو اپنے وسیع تر مقاصد کے مطابق کر سکے۔ یہی معجزہ ہے، اس سے مراد — جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے — قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ ان قوانین کو، جنہیں خدا کی عادات یا اُس کی سنت کہہ سکتے ہیں ہرگز توڑا نہیں جا سکتا۔ تاہم ایک نہایت محدود مفہوم میں ایک برتر قانون، اپنے سے ادنیٰ قانون کی کارفرمائی میں دخل انداز ضرور ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں کسی خاص مرتبہ وجود کے اندر ایسے افعال رونما ہوتے ہیں جن کی توجیہہ اُسی مرتبے کے لئے مخصوص علل و معلولات کی روشنی میں نہیں کی جا سکتی۔

قرآن حکیم میں 'ایمان بالغیب' کی جو ترکیب استعمال ہوئی ہے اسے معجزات کی بحث سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں ان افراد کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں جو کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ان خصوصیات میں 'ایمان بالغیب' کی حیثیت بنیادی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر یہ اصطلاح ایک بغیر سوچے سمجھے اور اندھے اعتقاد (Blind Faith) پر دلالت کرتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ قرآن کتاب مبین ہے۔ اس سے استفادہ کرنے کے لئے جو طریق کار بھی تجویز کیا جائے اس میں Mystification کا عنصر بہرحال موجود نہیں ہونا چاہیئے۔ ایمان دراصل علم و معرفت

بھی قرار رہتی ہے۔

یکسانی اور تعلیل کے قوانین بلاشبہ پوری کائنات میں جاری و ساری ہیں لیکن یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ قوانین وجود کے مختلف مدارج میں مختلف انداز سے کارفرما ہیں۔ جب ایک فطرتی سائنسدان (Natural Scientists) قوانین اور ان کی حکمرانی کی بات کرتا ہے تو اس کے تصور میں بالعموم صرف مادی قوانین ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مادہ درجاتِ وجود میں سے صرف ایک درجہ ہے۔ اس کے علاوہ حیات اور ذہن کے درجات بھی ہیں۔ یہ تینوں یعنی مادہ، حیات اور ذہن اپنی اپنی تعلیل میں منفرد ہیں۔ زندگی مادے سے اعلیٰ اور ذہن خود زندگی سے برتر ہے جب یہ مختلف طبقات ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں گے تو ہر اعلیٰ علیت ادنیٰ علیت پر اثر انداز ہوگی اور اس میں تغیر پیدا کرے گی۔ اس نقطے کی صراحت علامہ اقبال نے خدا سے مخاطب ہو کر بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ علامہ کے اشعار ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہاں اقبال نے خدا کی قدرت اور اس کی کاریگری سے مقابلہ نہیں کرنا چاہا ہے بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انسان کس طرح اپنے ذہن اور ارادے سے مادی کائنات کے فطری رجحانات کو اپنے تابع بنا سکتا ہے۔ وہ شخص جو محض مادی سطح پر سوچنے کا عادی ہے اُسے اس نوعیت کے مظاہر پر یقیناً احساس ہوگا کہ قوانین فطرت کے خلاف بات ہو گئی ہے۔ وہ اس اختلاف کی تصویب (Justification) کے لئے مادی کائنات ہی کی طرف رجوع کرے گا اور مختلف مفروضات وضع کر کے انہیں ثابت کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اُس کی یہ کوشش کبھی مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ وہ اپنی تحقیق میں کائنات کے اعلےٰ مدارج کو نظر انداز کر رہا ہوگا۔

ایک عام آدمی کو ان تین طبقات کے علاوہ کسی شے کا تجربہ اور مشاہدہ

ہی کی ایک صورت ہے ۔ یہ اُس یقین محکم سے عبارت ہے جس کے مطابق مرئی حقائق سے ماوری موثر مداقتیں موجود ہیں اور محسوس اشیاء ہی کل کائنات نہیں ہیں قرآن نے یقیناً مادی کائنات کی اہمیت اور اس کے بارے میں غور و فکر کرنے پر بہت زور دیا ہے لیکن مختلف مظاہر کو محض آیات الٰہیہ کا درجہ دیا گیا ہے ۔ اس لحاظ سے فطرت کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعتاً موجود ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کے اندر کچھ مابعد الطبعی اور تصوراتی جہتیں پائی جاتی ہیں ۔ وہ لوگ جو ان جہتوں سے ناآشنا ہیں کائنات کو عملی اعتبار سے خود مکتفی سمجھتے ہیں ان کے نزدیک خدا ایک موثر اور فعال ہستی نہیں ہے جو ہماری دُعاؤں کو قبول کرتی ہے ۔ جس سے معجزات کا صدور ہوتا ہے اور جو انسان کے ساتھ ایک شخصی رشتہ استوار کر کے مختلف مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کے ساتھ شریک کار ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس اگر ان جہتوں کو ملحوظ رکھا جاتے تو ہم اس زمان و مکان کی کائنات پر جس قدر زیادہ غور کریں گے معجزات پر ہمارا یقین و ایمان اُسی قدر راسخ ہوتا چلا جائے گا ـــــ

(قرآن کانفرنس منعقدہ ۲۹ / مارچ ۸۱ء قرآن اکیڈمی میں پڑھا گیا ۔)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بقیہ : "علم اور رجائیت"

ـــــ اس شخص کو حواس کے دیئے ہوئے علم کو کام میں لاتے ہوئے اور اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے، غیب پر ایمان لے آتا ہے اور وحی الٰہی کو اعلیٰ ترین اور صحیح ترین منبع علم جانتا ہے ـــــ قبولیتِ دعا کے کسی لمحے پکار اٹھتی ہے:

"یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی
رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً"

علم اور رجائیت

از قلم
صلاح الدین ایوبی

ارشادِ ربانی ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب یہ بات اپنی جگہ اہم کہ پروردگارِ حقیقی سے بڑھ کر لائقِ عبادت اور کونسی ہستی ہوسکتی ہے اور ذکرِ الٰہی سے بڑھ کر اور کون سا ذکر ہے۔ لیکن یہ بات اس جملہ کے پہلے جزو سے بھی بزیادہ لائقِ اعتبار اور حاملِ عمومیت ہے کہ اطمینانِ قلب سے بڑھ کر اور کوئی شے چاہے جانے کے قابل نہیں۔ طمانیتِ قلب حاصل کرنے کے لئے ہر بنی آدم اپنے اپنے مبلغِ علم کی بنیاد پر نشان ہائے منزل ترتیب دے لیتا ہے اور اسی نسبت سے ہر ایک کے نزدیک اقدار کا ڈھانچہ بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ یہ اقدار خالص ترین مادیت سے لے کر اعلیٰ ترین روحانیت تک Range کرتی ہیں۔ بایں ہمہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امید اور جستجو بجائے خود انسانی زندگی کی اہم ترین اقدار ہیں ؎

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست
فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

اب سوال یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے مطلوب کا جو معیار تشکیل دیتا ہے اس کی بنیاد کیا ہوا کرتی ہے؟ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مطلوب و مقصود کا انتخاب مبلغِ علم پر منحصر ہے اور مبلغِ علم کا دارومدار درحقیقت منبعِ علم ہے۔ ہر شخص کا یہ انتخاب کہ وہ کون کون سے ذرائعِ علم کو اپنے لئے اہم اور قابلِ عمل جانتا ہے۔ اس کے نظامِ اقدار پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

فلاسفہ اور مفکرین نے مختلف ادوار میں مختلف منبع ہائے علم کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ اور ان کی متابعت میں چلنے والی اولادِ آدم نے اسی رجحان سے اپنے نظامِ زندگی کو تشکیل دیا چنانچہ Bacon نے نیچر (Nature) کو ذریعہ علم سمجھا اور حواس کی معرفت کو یقینی سمجھا۔ Descartes نے خدا کو حقیقت ثابتہ تسلیم کرتے ہوئے عقل کو علم کا حقیقی منبع قرار